© rasailojaraid.com

جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس

تعلیم کے بارے میں چند خیالات

پچھلے دنوں معلوم ہوا کہ اساتذہ کی ایک تنظیم شرائط ملازمت کو بہتر بنانے کے لیے ٹریڈ یونین کے انداز پر اپنے مطالبات پیش کرنے پر غور کر رہی ہے۔ ان مطالبات میں گریڈ میں اضافے کا مطالبہ بھی شامل ہے اور اس ضمن میں تجویز ہے کہ ایک گریڈ ۲ ہزار روپیہ ماہوار تک کا ہو۔ معاً مجھے اپنے زمانے کے وہ استاد یاد آ گئے جن میں سے بیشتر علمی لحاظ سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ بہت ذمہ داری سے اور دل لگا کر اپنے فرائض ادا کرتے تھے مگر ان کا کیریئر چار پانچ سو ماہوار پر آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ میرے ذہن میں چینی مفکر کنفیوشس بھی گھومنے لگا، جس کے زمانے میں تعلیم کے لیے معاوضے کا تصور بھی نہ تھا۔ حصول علم اور اس کے لیے زندگی تج دینا عظیم ترین مسرت سمجھی جاتی تھی۔ کسی کے پاس علم کا ہونا ہی اس پر یہ لازم کر دیتا تھا کہ اسے دوسرے طالب علم تک پہنچائے۔ استاد اور عالم اس کو کہتے تھے جس کی نظر میں دینوی آرام و آسائش کی کوئی حقیقت نہ ہو اور وہ سخت محنت کوش، زبان کا محتاط اور بلند اصولوں کا حامل ہو۔ دانش کا حصول اصل مقصد ہوتا تھا۔ غربت نااہلیت نہیں بلکہ حصول علم کے لیے ایک اضافی صفت تصور کی جاتی تھی۔ جہاں تک اساتذہ کے نقطہ نظر کا سوال ہے مجھے علی گڑھ یونیورسٹی کے شمس العلماء یاد آ گئے جنہوں نے ازخود ۷۵ روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اپنے عہدے کے لحاظ سے وہ پانچ سو روپے ماہوار کے حق دار تھے۔ یہ صرف نصف صدی پہلے کی بات ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ واقعی بدل گیا ہے۔

پھر میرا ذہن ان خرابیوں کی طرف منتقل ہوا جو خوش حالی اور دولت مندی کے ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ مغرب کی طاقت ور اور دولت مند اقوام کے دانش وروں کی فکر کا تانا بانا مادی دولت کے حصول سے ہی بنا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انہیں یہ مقام بڑی سخت سیاسی اور معاشی جدوجہد کے بعد حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ مغربی اقوام جن کے تمدن و تہذیب کی ہم بڑی تعریف کرتے ہیں' دراصل اقتصادی بندھنوں کی غلام ہیں۔ ہمیں اس اخلاقی زوال اور تباہی کا حال بھی معلوم ہے جو ان مغربی اقوام میں وبا کی طرح پھوٹ پڑی ہے۔ ان کی سعی اور جدوجہد کا محور اب محض بے معنی مسرت اور لذت کا حصول ہے۔

ہمارے پاکستانی عوام کے لیے آرام طلبی زہر ہے۔ ہماری دیہی آبادی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ فطرت کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے جفاکشی کی زندگی گزارنا ان کا ایسا معمول ہے جو تبدیل نہیں ہوتا مگر یہ ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہو گا کہ ہماری وہ نسل جو تعلیم گاہوں میں پرورش پا رہی ہے اور جس کو مستقبل کی قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں' آرام طلبی کا نقطہ نظر اپنالے۔ ہمارا مستقبل ہر میدان' بالخصوص دفاع کے میدان میں جفاکشی پر منحصر ہے۔۔۔ اگر ہماری تعلیم یافتہ نسل نے مثالی رہنمائی کا فرض انجام دیا تو ہمارے عوام خدا کی مدد سے اس بوجھ اور ذمہ داری کو کامیابی سے اٹھالیں گے۔ لیکن اگر تعلیم یافتہ طبقے کو یہ سکھایا گیا ہو کہ وہ دولت کے پجاری' نفس کے بندے یا بغیر محنت اور دھوکے سے حاصل ہونے والی عزت و شہرت کے خواہاں ہوں تو ہمارا انجام ماضی کی ان بے شمار اقوام سے مختلف نہ ہو گا۔ جب ایک خودغرض گروہ کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا تو عوام نے نئے فاتحوں کے آگے بلاچون و چرا سر جھکا دیا۔

پاکستان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑی واحد ضمانت یہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں قیادت کی تربیت حاصل کرنے والی نئی نسل کے ذہن میں پاکستان اور اس کی خیرخواہی اور بھلائی کے لیے شعور بیدار کیا جائے۔ بیرونی خطرات کے مقابلے میں اطمینان اور علم کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرنا اس کل کے چیلنج کے صرف ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے کچھ سال پہلے ایک فیصلہ لکھا تھا جس میں مناسب انداز سے پاکستان کے دستوری ضمیر (Constitutional Conscience) کا حوالہ دیا تھا۔ حوالہ دستور کے مقدمہ کے ان مقدس الفاظ پر مبنی تھا جس میں پاکستانی عوام کی اس مرضی کا اظہار کیا گیا ہے کہ

"جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور عدل اجتماعی کے وہ اصول جو اسلام نے بتائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، مکمل طور پر اختیار کیے جائیں گے۔"

ان پانچ تصورات کے تقاضے ہر پاکستانی کے ضمیر میں ہونے چاہئیں۔

اساتذہ کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان ذمہ داریوں سے آشنا کریں اور ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔ یہ کافی نہیں کہ مثلاً جیومٹری کا ایک استاد تھیوریز کی گنی چنی تعداد یا انگریزی کا استاد نصاب کے مقررہ اسباق پڑھا دے۔ استاد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اگر وہ اشیاء کا محدود تصور سیکھے گا تو دراصل وہ طلبہ کے اندر بھی ایسا ہی محدود نقطہ نظر پرورش کرے گا۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ طلبہ یہ مضحکہ خیز مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کو بغیر مقررہ ضروری قابلیت کے ڈگریاں دے دی جائیں۔

میں نے "دستوری ضمیر" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ضمن میں اخلاقی پہلو بھی فوراً ہی سامنے آجاتا ہے۔ مقدمہ دستور کے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ "جمہوریت' آزادی' مساوات....." انھیں سے اخلاقی تصورات کا احاطہ بھی ہو جاتا ہے لیکن اس مقدمہ میں اس سے زیادہ براہ راست ایک ہدایت اور بھی ہے' جس کا تخاطب ملک کے اکثریتی گروہ سے ہے۔ براہ راست "فرمان" یہ ہے۔

"پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل کیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگیاں اسلام کی ان تعلیمات کے مطابق گزار سکیں جو قرآن اور سنت میں بیان کی گئی ہیں۔"

میرے کان ان الفاظ کے زیروبم میں ملک کی نئی نسل کی تعلیم کے ذمہ دار حضرات کے نام ایک کھلا فرمان سن رہے ہیں کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے شاگردوں کو مناسب موقعوں پر یہ بتائیں کہ "قرآن و سنت میں بیان کردہ اسلامی تعلیمات" کیا ہیں۔ کیا ان الفاظ کا یہ مطلب ہے ہی نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ کیا یہ صرف میرے اپنے تخیل کی صدائے بازگشت ہے؟ کیا یہ کام صرف دینی تعلیم کے استاد پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس عظیم تقاضے اور امید کو حقیقت کا روپ دے؟ جب بین الاقوامی اشاعت رکھنے والے عالمی رسائل و جرائد مشرق کے لوگوں پر نااہلی اور کام سے جی چرانے کا الزام لگاتے ہیں تو کیا ہمارے اساتذہ کے قلب و ضمیر میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں وہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی چبھن اور کسک محسوس کریں؟ اور یہ چبھن انہیں ان کی ذمہ داریاں ادا کرنے پر اکسائے۔ کیا انسان کے ان بنیادی امور کے بارے میں اسلام کی کتاب مقدس میں واضح ہدایات نہیں ہیں؟ کیا اس کے برعکس یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس کتاب میں شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اپنے ماننے والوں کو خدا کی ناراضگی کے خطرے سے ڈرا کر اپنے فرائض اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق کامل دیانت داری سے انجام دینے پر آمادہ نہ کرتا ہو۔ کیا دیانت اور سچائی کی تعلیم اس کتاب کی جان نہیں ہے؟

پھر آخر ہم کیوں اپنے بارے میں ان آراء کو گوارا کرتے ہیں اور وہ ادارے جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہیں' اس الزام کے داغ کو دھونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ کوئی بھی مسلمان اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ خدا نے انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ زمین پر ایک ایسا اخلاقی نظام قائم کرے جہاں برائی مٹائی جائے اور بھلائی کو فروغ دیا جائے۔ اخلاقی بندھنوں کو توڑنے والے عوامل نے مشرق کی قوموں پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر جو صدیوں کی کوششوں سے بنا تھا۔ بیرونی معاشی اور سیاسی قوتوں کے زیر اثر ختم ہو چکا ہے۔ ذہن کی وہ راستی و سلامتی جو عقائد پر اور نسل در نسل خود اپنی بولی اور لکھی جانے والی زبان میں جمع ہونے والے ذخیرۂ معلومات کی اساس پر قائم تھی' کس طرح برقرار رکھی جائے جبکہ علم غیر مربوط مضامین پر الگ الگ ٹکڑوں کی شکل میں پہنچایا جائے اور بدترین بات تو یہ ہے کہ ایک غیر ملکی زبان میں۔

گذشتہ دنوں مجھے خوش قسمتی سے کچھ ایسے اہل علم سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کی تعلیم مسلم طور طریقے سے ہوئی تھی۔ انہیں فارسی' عربی اور اردو پر قدرت حاصل تھی۔ مختلف انسانی معلومات پر ان کی فکر کی ہمہ گیری اور فکر کی راستی میرے لیے بڑی مسرت کا باعث ہوئی۔ یہ بات کہ وہ دور جدید کی بعض تکنیکوں سے ناواقف تھے' میرے نزدیک کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی اس لیے کہ اگر دینی ضرورت ہو تو وہ جب بھی چاہیں' کسی تکنیک کو بھی اخذ اور اختیار کرنے کے قابل ہیں۔

باطن کی یہ قوت' کردار کی یہ مضبوطی اور فکر کی یہ ہمہ گیری میرے یقین کے مطابق آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کا نہ ہونا دلوں کے خالی ہو جانے کی اس کیفیت کا سبب ہے جو آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ جب معاشرے کو گرفت میں رکھنے والی مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں تو وہ نفسیاتی قوتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں جو انسان کے لاشعوری ردعمل کو قابو میں رکھتی ہیں۔

اگر مذہبی اور روایتی معاشرتی بندھن باقی نہ رکھے جائیں تو معاشرے کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ معاشرے کے سوچنے والے طبقے کے لیے یہ امر خطرے کی گھنٹی ہونا چاہیے کہ تعلیمی عمل مذہبی اور روایتی اثرات کو گھٹانے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تعلیم کا عام معیار بھی گھٹیا ہے۔ اس سے فارغ ہونے والے' ہاتھوں میں ڈپلومے اور ڈگریاں پکڑے ہوئے لوگ کلرکی اور چھوٹے درجے کے استادوں کی جگہیں پر کرنے کے لیے بہت موزوں ہیں لیکن یہاں پہلے ہی بہت بھیڑ ہے۔ ناقص تعلیم پائے ہوئے بیکار اور اپنی مذہبی و معاشرتی جڑوں سے اکھڑے ہوئے لوگوں کا جم غفیر ہولناک منظر کی طرح سامنے ہے۔

یہ وہ میدان ہے جہاں میرے خیال میں قدیم علم کے حامل لوگوں کو برتری حاصل ہے۔ ان کی تعلیم ان کی دینی زبانوں میں مربوط انداز سے باہم متعلق موضوعات پر ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان ایسے افراد بھی ہیں جو اس قسم کی تعلیم کو دنیوی امور میں کامیابی کے لیے نااہلیت سمجھتے ہیں اور اپنے اس موقف کی حمایت میں اس امرواقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ اس تعلیم کے فارغ التحصیل افراد جدید سرگرمیوں کے دھارے سے اپنے آپ کو اپنی مرضی سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ مجھے تو سچائی دوسرے پلڑے میں محسوس ہوتی ہے۔ میں ایک مثال دوں گا۔ یہ مثال ہمارے عظیم فلاسفر شاعر علامہ اقبال کی ہے۔ ابتدائی عمر ہی میں شمس العلماء میر حسن کی رہنمائی میں اردو' عربی اور فارسی کے اچھے علم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت مسلم عقائد کی بنیادوں اور اسلام کی کتاب مقدس پر مبنی فہم و کردار کی گہرائی سے ہو چکی تھی۔ بعد میں انہوں نے انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ جب انہوں نے اپنے فکر و فلسفہ کے لیے ان زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا تو اس پر ساری دنیا نے تحسین کی لیکن ان کے فلسفہ کا حقیقی منبع ان کا روایتی علم ہی تھا۔ اردو اور فارسی میں مکمل قدرت بیان کے ساتھ شاعرانہ انداز میں اظہار نے ان کی عبقریت کو اس کے حقیقی مقام تک پہنچایا.... میں پوچھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گا کہ اگر ان کی ابتدائی تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی ہوتی جیسی کہ ان کے ہزاروں ہم وطنوں کی ہو رہی تھی' اور بعد میں وہ اپنی زبانوں کی طرف اور اسلام کے علم کی طرف متوجہ ہوتے تو کیا نتیجہ یہی ہوتا؟ میرے نزدیک تو نتیجہ وہی ہوتا جو آج ہم اپنے چاروں طرف اور خود اپنے اندر دیکھ رہے ہیں۔

غالباً" اس حقیقت کا پوری طرح احساس نہیں کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن کے لیے جس کو صدیوں سے ایک لکھی اور بولی جانے والی قدرتی زبان میں نشوونما دیا گیا ہے۔ (اس کی) مزید نشوونما اور (اس کو) درجہ کمال تک پہنچانا اس زبان میں سب سے موزوں ہے۔ علم کے تمام اعلیٰ میدان فنون' سائنس' انسانیات' سب خیالی فکر(Abstract Thought) پر زیادہ سے زیادہ مہارت چاہتے ہیں اور انسانی ذہن سب سے بہتر حصول اپنی موروثی زبان میں ہی کر سکتا ہے۔ پھر اس کو دوسری زبان میں بیان کرنے کی قابلیت آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی میرے اس یقین کی اساس ہے کہ اگر ہمارے علماء تخلیقی نتائج پیش کرنا چاہتے ہیں تو ان کی بنیادی تعلیم ان کی اپنی زبان میں ہونا ناگزیر ہے۔

اپنے دوسرے ہزاروں ہم وطنوں کی طرح میں بھی اس حقیقت کی شدید مذمت کرتا ہوں کہ ہمارا تعلیم عامہ کا نظام جو زیادہ تر انگریزی زبان میں جاری ہے' فکر کے ارتقاء بلکہ محض اظہار خیال میں اتنا معمولی حصہ ادا کر رہا ہے۔ انگریزی لٹریچر میں ڈگری لینے والے ہزاروں طالب علموں میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے اندرونی احساس سے انگریزی میں کوئی نیا جملہ کہہ دیا ہو۔ ان کا رجحان یہ ہے کہ جو تحریرات انہوں نے پڑھی ہیں' ان ہی سے اقتباسات نقل کیے جائیں۔ اس طرح حصول علم کی راہ میں حقیقی قدم آگے نہیں بڑھتا۔ انگریزی کی یہ مہارت انہیں بس اس قابل کر دیتی ہے کہ مقامی انگریزی ماخذ سے اخذ کردہ روشنی میں اٹک اٹک کر چلتے رہیں۔ یہ ان کو مستقلاً" ایک کم تر حقیقت عطا کر دیتی ہے۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس پر فخر کا احساس ہو۔

میرے پاس اس کے لیے ایک علاج ہے۔ میرے خیال میں یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ عمر جس میں بچہ انگریزی سیکھتا ہے' آگے بڑھائی جائے۔ ابتدائی زمانہ کل کا کل اسے اپنی زبان' اپنے مذہب کے فلسفہ و عقائد اور اپنے ملک کی تہذیبی روایات سے خوب اچھی طرح واقف کرانے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گزارا جائے۔ اردو، عربی اور فارسی کے نصابات پر نظرثانی کر کے انہیں جدید بنایا جائے اور ان کی مقدار بڑھائی جائے۔ تقریباً چودہ سال کی عمر تک طالب علم کی تربیت اپنی زبان، مذہب اور تہذیب میں اچھی طرح ہو چکے گی۔ اسے اپنے ملک کے تاریخی، جغرافیائی اور معاشی و سیاسی حالات کا علم اپنی زبان میں ہو چکا ہو گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی میں مذہبی و تمدنی مطالعہ نسبتاً اچھے درجہ کا کر چکا ہو گا۔

میرے نزدیک یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ موضوعات چودہ سالہ بچے کے ذہن کی پہنچ سے باہر ہوں گے۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کی اکیڈمی میں ۱۷ سال کی عمر میں مذہب و فلسفہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ۱۴ سال کی عمر ہونے پر طالب علم کو انگریزی زبان سکھائی جائے، آگے جو مضامین اسے پڑھنے ہیں ان کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے۔ اب ہمارے ملک میں بھی قبل ملازمت مدت تعلیم میں اضافہ کے رجحانات پیدا ہو چکے ہیں۔ ۱۴ اور ۲۴ سال کی عمر کے دوران میں ۱۰ سال کا وقفہ جدید اور تکنیکی علوم کے حصول کے لیے کافی ہونا چاہیے جس کے بعد اپنے ذہنی معیار کے لحاظ سے وہ عملی زندگی میں داخل ہو جائے۔ ہر صورت میں وہ کردار کی اس استقامت کا حامل ہو گا جو اس دستور کے نفاذ کے لیے ضروری ہے جو اپنے شہریوں سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ دنیوی قانون کے زیراثر دوائر میں بھی اسلام کی دیانت، سچائی اور انصاف کے اصولوں پر عمل ہو اور یہ کہ پاکستان کے عوام قرآن و سنت کے احکام کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔

میں جانتا ہوں کہ ملکی نظام تعلیم پر اثرانداز ہونے والے ان عوامل پر حالیہ سالوں میں ماہرین کے کئی کمیشن توجہ دے چکے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ان کے نتائج پر تنبیہہ کر رہا ہوں۔ یہ تو صرف چند احساسات ہیں جو اس تمنا کا مظہر ہیں کہ ہمارے دستور کے احکامات عملی جامہ پہن سکیں۔ ہمارے نظام تعلیم کا مرکزی خیال اور اس کے طریقہ کار کا اس مقصد سے گہرا تعلق ہے۔ میرے خیال میں اس بات کی اجازت ہے کہ جو شخص ان امور پر کچھ تشویش محسوس کرے، وہ اپنے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں، (پیش کردے)۔ میں نے عاجزی سے اس مضمون میں یہی کہنے کی کوشش کی ہے۔

© rasailojaraid.com